کسی کو نہ سوجھی۔ اب جو سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کسی کو جانا چاہیے جو حضرت کو پکڑ کر گھسیٹ لائے۔''

یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ رتن آ پہنچی۔ جالپا اسے دیکھتے ہی وہاں سے نکل آئی اور اس کے گلے سے لپٹ کر بولی: ''بہن کلکتہ سے خط آ گیا۔ وہیں ہیں۔''

رتن: ''میرے سر کی قسم؟''

جالپا: ''سچ کہتی ہوں، خط دیکھ نا۔''

رتن: ''تم تو آج ہی چلی جاؤ۔''

جالپا: ''ہاں یہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔ تم چلو گی؟''

رتن: ''چلنے کو تو میں تیار ہوں، لیکن اکیلا گھر کس پر چھوڑوں۔ مجھے اس منی بھوشن پر شبہ ہونے لگا ہے۔ اس کی نیت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بینک میں بیس ہزار روپے سے کم نہ تھے۔ سب نہ جانے کہاں اڑا دیئے۔ کہتا ہے کریا کرم میں خرچ ہو گئے۔ حساب مانگتی ہوں تو آنکھیں دکھاتا ہے۔ دفتر کی کنجی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ مانگتی ہوں تو ٹال جاتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے ساتھ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔ ڈرتی ہوں میں ادھر جاؤں، ادھر یہ سب کچھ لے دے کر چلتا بنے۔ بنگلے کے گاہک آ رہے ہیں۔ میں بھی سوچتی ہوں دیہات میں جا کر اطمینان سے پڑی رہوں۔ میں نہ ہوں گی تو شاید روپے بھی مجھے دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ گوپی کو ساتھ لے کر آج ہی چلی جاؤ۔ روپے کا انتظام میں کر دوں گی۔''

جالپا: ''گوپی ناتھ تو شاید نہ جا سکیں۔ دادا کی دوا دارو کے لیے بھی تو کوئی چاہیے۔''

رتن: ''وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں روز سویرے آ جاؤں گی اور شام کو بھی ایک بار دیکھ جایا کروں گی۔''

جالپا: ''اور دن بھر ان کے ساتھ کون بیٹھا رہے گا؟''

رتن: ''میں تھوڑی دیر بیٹھی بھی رہا کروں گی، مگر تم آج ہی جاؤ۔ بیچارے پر وہاں نہ جانے کا گزر رہی ہوگی۔ تو یہی طے رہی نا؟''

رتن، منشی جی کے کمرے میں گئی تو رمیش بابو کھڑے ہو گئے اور بولے: ''آیئے! دیوی جی، رما بابو کا پتا تو چل گیا؟''

رتن: ''اس میں آدھی کارگزاری تو میری ہے۔''

رمیش: ''آپ کی صلاح سے تو ہوا ہوگا۔ اب انہیں یہاں لانے کی فکر کرنی چاہیے۔''

رتن: ''اس کی سب سے اچھی صورت یہی ہے کہ جالپا جا کر انہیں پکڑ لاویں۔ گوپی کو ساتھ لیتی جائیں۔ آپ کو اس میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے دادا جی؟''

منشی کو اعتراض تو نہ تھا۔ ان کا بس چلتا تو اس موقع پر دس پانچ آدمیوں کو اور جمع کر لیتے، مگر معاملہ ایسا آ پڑا تھا کہ کچھ بول نہ سکے۔

گوپی کلکتہ کی سیر کا ایسا اچھا موقع پا کر کیوں نہ خوش ہوتا۔ بشمبر دل ہی میں اینٹھ کر رہ گیا۔ خدا نے اسے کمسن نہ بنایا ہوتا تو آج اس کی حق تلفی کیوں ہوتی۔ گوپی ایسے کہاں بڑے ہوشیار ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، وہیں کچھ نہ کچھ کھو آتے ہیں۔ ہاں مجھ سے بڑے ہیں۔ قدرت کے نظام نے اسے مجبور کر دیا۔

رات کے نو بجے جالپا چلنے کو تیار ہوئی۔ ساس سسر کے قدموں پر سر جھکا کر دعائیں لیں۔ شمبر ناتھ رو رہا تھا۔ اسے گلے لگا کر پیار کیا اور موٹر پر بیٹھی۔ رتن سٹیشن تک پہنچانے کے لیے آئی تھی۔ موٹر چلی تو جالپا نے کہا: ''کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہوگا، وہاں پتا کیسے چلے گا؟''

رتن: ''پہلے اخبار کے دفتر میں جانا۔ وہاں سے پتا چل جائے گا۔''

جالپا: ''ٹھہروں گی کہاں؟''

رتن: ''دھرم شالہ میں یا ہوٹل میں ٹھہرنا۔ روپے کی ضرورت پڑے تو مجھے تار دینا۔ بابو آ جائیں تو میری ناؤ پار لگ جائے۔ یہ منی بھوشن مجھے تباہ کر دے گا۔''

جالپا: ''ہوٹل میں بدمعاش تو نہ آتے ہوں گے؟''

رتن: ''کوئی ذرا بھی شرارت کرے تو ٹھوکر مارنا۔ کچھ پوچھنا مت۔ ٹھوکر جما کر تب بات کرنا۔ (کمر سے ایک چھری نکال کر) اسے اپنے پاس رکھو۔ کمر میں چھپائے رکھنا۔ جب کبھی باہر نکلتی ہوں تو اسے اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اس سے دل بڑا مضبوط رہتا ہے۔ جو مرد کسی عورت کو چھیڑتا ہے تو سمجھ لو وہ پرلے سرے کا نامرد، کمینہ اور بدمعاش ہے۔ تمہاری چھری کی چمک اور تمہارے تیور ہی دیکھ کر اس کی روح فنا ہو جائے گی۔ سیدھا دم دبا کر بھاگے گا، لیکن اگر ایسا موقع آ ہی پڑے جب تمہیں چھری سے کام لینے پر مجبور ہونا پڑے تو ذرا مت جھجکنا۔ اس کی بالکل فکر نہ کرنا کہ کیا ہوگا، کیا نہ ہوگا۔ جو کچھ ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔

سٹیشن آ گیا۔ قلیوں نے اسباب اتارا۔ گوپی ٹکٹ لایا۔ جالپا پتھر کی مورت کی طرح پلیٹ فارم پر کھڑی رہی۔ گویا حواس مفلوج ہو گئے ہوں۔ کسی بڑی آزمائش

کے پہلے ہماری وہی حالت ہو جاتی ہے، جو آسمان کے طوفان آنے کے قبل ہوتی ہے۔

رتن نے گوپی سے کہا: ''ہوشیار رہنا۔''

گوپی ادھر کئی مہینوں سے ورزش کرتا تھا۔ چلتا تو موڈھے اور سینہ کو دیکھا کرتا۔ دیکھنے والوں کو تو وہ جیوں کا تیوں نظر آتا تھا، مگر اپنی نگاہ میں وہ کچھ اور ہو گیا تھا۔ شاید اسے تعجب ہوتا تھا کہ اسے آتے دیکھ کر کیوں لوگ راستے سے ہٹ نہیں جاتے۔ کیوں اس کی قد و قامت سے مرعوب نہیں ہو جاتے۔ اکڑ کر بولا:

''کسی نے ذرا بھی چوں چیڑ کی تو ہڈی توڑ دوں گا۔''

رتن مسکرائی: ''یہ تو مجھے معلوم ہے، سومت جانا۔''

گوپی: ''پلک تو جھپکے گی نہیں۔ مجال ہے نیند آ جائے۔''

گاڑی آ گئی۔ گوپی نے ایک ڈبے میں گھس کر قبضہ جما لیا۔ جالپا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ بولی: ''بہن دعا دو کہ انہیں لے کر خیریت سے لوٹ آؤں۔''

اس وقت اس کا کمزور دل کوئی سہارا ڈھونڈ رہا تھا اور دعا کے سوا وہ سہارا اور کہاں ملتا۔

انجن نے سیٹی دی، دونوں سہیلیاں گلے ملیں۔ جالپا گاڑی میں جا بیٹھی۔

رتن نے کہا: ''جاتے ہی خط بھیجنا۔''

جالپا نے سر ہلا دیا: ''اگر میری ضرورت معلوم ہو تو فوراً خط لکھنا۔ میں سب کچھ چھوڑ کر چلی آؤں گی۔''

جالپا نے سر ہلایا۔

''راستے میں رونا مت!''

جالپا ہنس پڑی۔ گاڑی چل دی۔

(36)

دیبی دین نے چائے کی دکان اسی دن بند کر دی اور دن بھر اس عدالت کی خاک چھانتا پھرتا تھا، جس میں ڈکیتی کا مقدمہ پیش تھا۔ رما ناتھ کی شہادت ہو رہی تھی۔ تین دن رما کی شہادت برابر ہوتی رہی اور تینوں دن دیبی دین نے کچھ کھایا نہ سویا۔ آج بھی اس نے گھر آتے ہی کرتا اتار دیا اور پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ پھاگن لگ گیا تھا اور کچھ گرمی شروع ہو گئی تھی، لیکن اتنی گرمی نہ تھی کہ پسینہ چلے اور پنکھے کی ضرورت ہو۔ اکثر لوگ تو ابھی تک جاڑے کے کپڑے پہنتے تھے، لیکن دیبی دین پسینے میں تر تھا۔ اس کا چہرہ جس پر معصوم بڑھاپا ہنستا رہتا تھا، کھسایا ہوا تھا۔ گویا بیگار لے لوٹا ہوا ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی لا کر رکھ دیا اور بولی: ''چلم بھر دوں؟''

دیبی دین کی یہ تین دن کی خاطر ہو رہی تھی۔ اس کے پہلے بڑھیا کبھی چلم رکھنے کو نہ پوچھتی تھی۔ دیبی دین اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ بڑھیا کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا:

''نہیں رہنے دو۔ چلم نہ پیوں گا۔''

''تو ہاتھ منہ دھولو۔ گرد پڑی ہوئی ہے۔''

''دھولوں گا۔ جلدی کیا ہے۔''

بڑھیا آج کا واقعہ سننے کے لیے بے قرار تھی۔ ڈر رہی تھی کہ دیبی دین جھنجھلا نہ پڑے اور اس کی تھکن مٹا دینا چاہتی تھی، جس میں دیبی دین خوش ہو کر آپ ہی آپ سارا قصہ کہہ چلے۔

''تو کچھ جل پان تو کر لو۔ دوپہر کو بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ مٹھائی لاؤں؟ پنکھا مجھے دے دو۔''

دیبی دین نے پنکھا دے دیا۔ بڑھیا جھلنے لگی۔ دو تین منٹ تک آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا: ''آج بھیا کی گواہی ختم ہو گئی۔''

بڑھیا کا ہاتھ رک گیا: ''تو کل سے وہ گھر آ جائیں گے؟''

دیبی: ''ابھی نہیں چھٹی مل جاتی۔ یہی بیان دیوانی میں دینا ہوگا اور اب وہ یہاں آنے ہی کیوں لگے۔ گھوڑے پر چڑھے چڑھے گھومیں گے، مگر ہے بڑا پکا۔ مطلبی۔ پندرہ آدمیوں کو بے گناہ پھنسا دیا۔ پانچ چھ کو تو پھانسی ہو جائے گی۔ دوسروں کو دس دس بارہ بارہ سال کی سجا دھری رکھی ہے۔ اس کے بیان سے مقدمہ ثابت ہو گیا۔ کوئی کتنی ہی جرح کرے، کیا مجال کہ جرا بھی ہچکچائے۔ اب ایک بھی نہ بچے گا۔ کس نے کیا، کس نے نہیں کیا، اس کا حال بھگوان جانیں۔ پر سب مارے جائیں گے۔ گھر سے بھی سب سرکاری روپیہ کھا کر بھاگا تھا۔ ہمیں بڑا دھوکہ دیا۔''

جگو نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا: ''اچھی نیکی بدی اپنے ساتھ ہے۔ مطلب کے

لیے تو دنیا ے۔کون کس کے لیے مرتا ہے۔''

دیبی: ''اپنے مطلب کے لیے جو دوسروں کا گلا کاٹے، اس کو جہر (زہر) دے دینا بھی پاپ نہیں ہے۔''

یکا یک دو آدمی آ کر کھڑے ہو گئے۔ایک گورا خوبصورت لڑکا تھا۔جس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زائد نہ تھی۔ دوسرا ادھیڑ تھا۔صورت سے چپراسی معلوم ہوتا تھا۔

دیبی دین نے پوچھا: ''کسے کھوجتے ہو؟''

چپڑاسی نے کہا: ''تمہارا ہی نام دیبی دین ہے؟ میں اخبار کے دفتر سے آیا ہوں۔یہ بابو انہیں رماناتھ کے بھائی ہیں، جنہیں شطرنج کا انعام ملا تھا۔یہ انہی کی تلاش میں دفتر گئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے تمہارے پاس بھیج دیا۔تو میں جاؤں؟''

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ دیبی دین نے گوپی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔صورت رماناتھ سے ملتی تھی۔بولا:

''آؤ بیٹا بیٹھو۔کب آئے گھر سے؟''

گوپی نے ایک کھٹک کی دکان پر بیٹھنا شان کے خلاف سمجھا۔کھڑا کھڑا بولا:

''آج ہی تو آیا ہوں۔بھابی جی ساتھ ہیں۔دھرم شالا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

دیبی دین نے کھڑے ہو کر کہا: ''تو جا کر بہو کر یہیں لاؤ نا۔اوپر تو رما بابو کا کمرہ ہے ہی۔آرام سے رہو۔دھرم شالے میں کیوں پڑے رہو گے۔نہیں۔چلو میں بھی چلتا ہوں۔یہاں سب طرح کا آرام ہے۔''

اس نے جگو کو یہ خبر سنائی۔ اوپر جھاڑو لگانے کو کہہ کر گوپی کے ساتھ دھرم شالے چل دیا۔ بڑھیا نے فوراً اوپر جا کر جھاڑو لگائی۔ لپک کر حلوائی کی دکان سے مٹھائی اور دہی لائی۔ صراحی میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ پھر اپنا منہ ہاتھ دھویا۔ ایک رنگین ساڑھی نکالی۔ گہنے پہنے اور بن ٹھن کر بہو کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا دیر میں فٹن بھی آ پہنچی۔ بڑھیا نے جا کر جالپا کو اتارا۔ جالپا پہلے تو ساگ بھاجی کی دکان دیکھ کر کچھ جھجکی مگر بڑھیا کی مادرانہ خاطر مدارات دیکھ کر اس کی جھجک دور ہوگئی۔ اس کے ساتھ اوپر گئی تو ہر ایک چیز اس طرح اپنی جگہ پر پائی گویا اپنا ہی گھر ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی رکھ کر کہا: ''اس گھر میں بھیا رہتے تھے بیٹی۔ آج تو پندرہ دن سے گھر سونا پڑا ہوا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر منہ جھوٹا کر لو۔ بھیا کا حال تو ابھی تمہیں نہ معلوم ہوگا۔''

جالپا نے سر ہلا کر کہا: ''کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ اخبار کے دفتر میں اتنا معلوم ہوا کہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔''

دیبی دین بھی اوپر آ گیا تھا۔ بولا: ''گرفتار تو کیا تھا مگر اب تو وہ ایک معاملہ میں سرکاری گواہ ہو گئے ہیں۔ پراگ راج میں ان پر اب کوئی مقدمہ نہ چلے گا اور سنا ہے نوکری چاکری بھی مل جائے گی۔''

جالپا نے بے خوفی کے ساتھ کہا: ''وہاں تو ان پر کوئی مقدمہ نہیں ہے۔''

دیبی دین نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''سنا ہے کچھ روپے پیسے کا معاملہ تھا؟''

جالپا: ''وہ تو کوئی بات نہ تھی۔ جوں ہی ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان سے کچھ

سرکاری رقم خرچ ہوئی ہے۔ اسی وقت روپے داخل کر دیئے۔ یہ فضول گھبرا کر چلے آئے اور پھر ایسی چپ سادھی کہ اپنی خبر تک نہ دی۔''

دیبی دین کا چہرہ روشن ہو گیا۔ گویا کسی درد سے آرام مل گیا ہو۔ بولا: ''تو یہ ہم لوگوں کو یا معلوم۔ بار بار سمجھایا کہ گھر چٹھی پتر بھیج دو۔ لوگ گھبراتے ہوں گے، مگر مارے شرم کے لکھتے ہی نہ تھے۔ اسی دھوکے میں پڑے ہوئے تھے کہ وہاں ان پر مقدمہ چل رہا ہوگا۔ جانتے تو سرکاری گواہ کیوں بنتے۔''

سرکاری گواہ قوم میں کتنا بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اسے کتنا ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ اس سے چھپانہ تھا۔ سرکاری گواہ کیوں بنائے جاتے ہیں۔ کس طرح انہیں ترغیبیں دی جاتی ہیں۔ کس طرح وہ پولیس کے کٹھ پتلے بن کر اپنے ہی دوستوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ یہ اسے معلوم تھا۔ اگر کوئی آدمی اپنی ناہمواریوں پر شرمندہ ہو کر حقیقت کا انکشاف کرے۔ دغا اور فتنہ انگیزی کا پردہ ہٹا دے تو وہ فرشتہ ہے۔ اس کی حق پسندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، مگر شرط یہی ہے کہ اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنے کیے کا پھل بھوگنے کو تیار ہو۔ ہنستا کھیلتا پھانسی چڑھ جائے، لیکن اپنی جان بچانے کے لیے یا خودغرضی کے زیر اثر سزا سے خائف ہو کر جو اپنے رفیقوں سے دغا کرے۔ آستین کا سانپ بن جائے۔ وہ نامرد ہے۔ بے غیرت ہے۔ بے حیا ہے۔ ایسے آدمی کو دنیا کبھی معاف نہیں کرتی۔ کبھی نہیں۔ یہاں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ رما نے سزا کے خوف سے اپنے گردگناہوں کا پردہ نہیں کھوایا تھا۔ اس میں کم سے کم سچائی تو ہوتی۔ قابل نفرین ہونے پر بھی بات تو سچی ہوتی۔ یہاں تو ان گناہوں کا پردہ کھوایا گیا تھا، جن کی ہوا تک اسے نہ لگی تھی۔

جالپا کو اس کا یقین نہ آیا۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات اور ہوئی ہوگی، جس نے رما کو سرکاری گواہ بننے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ شرماتی ہوئی بولی:

''کیا یہاں بھی کوئی بات ہوئی تھی؟''

دیبی دین نے اطمینان انگیز لہجہ میں کہا: ''کوئی بات نہیں۔ پراگ راج سے وہ میرے ساتھ ہی یہاں آئے۔ جب سے یہاں سے کہیں گئے نہیں۔ باہر نکلتے ہی نہ تھے۔ بس ایک دن نکلے اور اسی دن پولیس نے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈرے کہ مجھی کو پکڑنے آ رہا ہے۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سپاہی کو کھٹکا ہوا۔ اس نے شبہے میں گرفتار کر لیا۔ میں بھی ان کے پیچھے تھانے پر پہنچا۔ دروغا پہلے تو رشوت مانگتے تھے، مگر جب میں روپے لے کر پہنچا تو وہاں اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ افسروں نے نہ جانے ان سے کیا بات چیت کی۔ بس سرکاری گواہ بن گئے۔ مجھ سے بھیا نے یہی کہا کہ اس معاملے میں بالکل جھوٹ نہ بولنا پڑے گا۔ میں کیا کرتا۔ چپ ہو رہا۔''

جگو: ''نہ جانے سبھوں نے کون سی بوٹی سنگھا دی۔ بھیا تو ایسے نہ تھے۔ دن بھر اماں اماں کرتے رہتے تھے۔ دن بھر سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ مرد بھی عورت بھی۔ کیا مجال کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔''

دیبی: ''کوئی برائی نہ تھی۔ میں نے تو ایسا لڑکا ہی نہیں دیکھا۔''

جالپا نے کچھ سوچ کر کہا: ''کیا ان کا بیان ہو گیا؟''

دیبی: ''ہاں تین دن برابر ہوتا رہا۔''

جالپا نے پوچھا: ''ان سے میری ملاقات تو ہو جائے گی؟''

دیبی دین نے مسکرا کر کہا: ''ہاں اور کیا، جس نے سارا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا۔ پولیس ایسی گدھی نہیں ہے۔ آج کل کوئی بھی ان سے ملنے نہیں پاتا۔ کڑا پہرہ رہتا ہے۔''

اس مسئلہ پر اس وقت زیادہ بحث نہ ہو سکی۔ اس گتھی کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ جالپا نے گوپی کو بلایا۔ وہ چھجے پر کھڑا سڑک کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ گویا سسرال آیا ہو۔ جالپا نے کہا:

''منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا لو تو۔''

گوپی شرما کر پھر باہر چلا گیا۔

دیبی دین سمجھ گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے یہ لڑکا کچھ کھاتے شرماتا ہے۔ بولا:

''اب ہم دونوں جاتے ہیں تمہیں جس چیز کی ضرورت ہم سے کہہ دینا۔ بھیا کو تو ہم اپنا ہی سمجھتے تھے اور ہمارے کون بیٹھا ہوا ہے۔''

جگو نے غرور سے کہا: ''وہ تو میرے ہاتھ کا بنایا کھا لیتے تھے۔''

جالپا نے مسکرا کر کہا: ''اب تمہیں کھانا نہ پکانا پڑے گا ماں جی۔ میں پکا دیا کروں گی۔''

جگو نے ٹوکا: ''ہماری برادری میں دوسرے کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔ بہو۔ اب چار دن کے لیے برادری میں کیا نکو بنیں۔''

جالپا: ''ہماری برادری میں بھی تو دوسروں کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔''

جگو: ''تمہیں یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے آدمی ان باتوں کا بچار بھی تو نہیں کرتے۔ ہماری برادری تو گنواروں کی ہے۔''

جالپا: ''یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم پکاؤ اور میں کھاؤں۔ جسے بہو بنایا اس کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔''

اس اپنے پن سے بھرے ہوئے جملے نے دیبی دین کے دل پر چوٹ کی۔ بولا: ''بہو نے بات تو بڑے پتے کی کہی۔ اس کا جواب سوچ کر دینا ہوگا۔ ابھی چلو۔ ان لوگوں کو آرام کرنے دو۔''

دونوں چلے گئے تو گوپی نے آ کر کہا: ''بھیا اسی کھٹک کے یہاں رہتے تھے کیا۔ کھٹک ہی معلوم ہوتا ہے۔''

جالپا نے پھنکار کر کہا: ''کھٹک ہوں یا چمار، لیکن ہم سے اور تم سے تو سو گنے اچھے ہیں۔ ایک پردیسی آدمی کو چھ مہینہ تک گھر میں رکھا۔ کھلایا پلایا۔ ہم میں ہے اتنی ہمت۔ یہاں تو کوئی مہمان آ جاتا ہے تو وہ بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ نیچ ہیں تو ہم ان سے کہیں نیچے ہیں۔''

گوپی منہ ہاتھ دھو چکا تھا۔ مٹھائی کھاتا ہوا بولا: ''کسی کو ٹھہرا لینے سے کوئی اونچا نہیں ہو جاتا۔ چمار کتنا ہی دان پن کرے، پر رہے گا چمار ہی۔''

جالپا: ''میں اس چمار کو اس پنڈت سے اچھا سمجھوں گی جو دوسروں کو دغا دے۔''

جل پان کر کے گوپی تو شہر گھومنے چلا گیا۔ جالپا نے کچھ نہ کھایا۔ اس کے سامنے ایک مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ رما کو اس دلدل سے کیسے نکالے۔ اس پر رسوائی اور جگ ہنسائی کے خیال سے ہی اس کا ضمیر مجروح ہوا اٹھتا تھا۔

ان بے گناہوں کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ ملزموں میں نہ جانے کون گنہگار

ہے۔کون بے گناہ۔سبھی سزا پا جائیں گے۔شاید دو چار کو پھانسی ہو جائے۔یہ خون ناحق کس کی گردن پر ہوگا؟

اس نے پھر سوچا۔لوگ کہتے ہیں یہ ڈھکوسلا ہے۔کون جانتا ہے کسی پر بیتا پڑتی ہے یا نہیں۔یہ بھی مان لیا کہ کسی پر بیتا نہ پڑے گی، لیکن اپنی غرض کے لیے دوسروں کو خطرہ میں ڈالنا کتنا شرمناک ہے۔رما نے اسے قبول ہی کیوں کیا۔اگر مقدمہ چلنے کا خوف بھی تھا تو سال دو سال کی قید کے سوا اور کیا ہوتا۔محض اس سزا سے بچنے کے لیے یہ دغا۔اب معلوم بھی ہو جائے کہ میونسپلٹی کچھ نہیں کر سکتی تو کیا ہو سکتا ہے؟ان کی شہادت تو ہوگئی۔

یکا یک ایک نقطہ کسی باریک کیل کی طرح اس کے دل میں چبھ گیا۔یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اپنا بیان تبدیل کر دیں۔انہیں معلوم ہو جائے کہ ان پر کوئی مقدمہ نہ چلے گا۔تو شاید وہ خود ہی اپنا بیان بدل دیں،مگر یہ معاملہ ان کے کانوں تک کیسے پہنچے۔

وہ اضطراب کے عالم میں نیچے آئی اور دیبی دین سے بولی:''کیوں دادا ان کے پاس کوئی خط بھی نہیں پہنچ سکتا۔پہرہ والوں کو دس پانچ روپے دینے سے تو شاید خط پہنچ جائے۔''

دیبی دین نے نفی میں گردن ہلا کر کہا:''مشکل ہے۔پہرہ پر بڑے منجھے ہوئے آدمی رکھے گئے ہیں۔میں دو بار گیا تھا،سبھوں نے پھاٹک پر کھڑا بھی نہ ہونے دیا۔''

''اس بنگلے کے آس پاس مکان دکان تو ہوں گے؟''

''ہاں ہیں، کیوں نہیں ایک طرف تو دوسرا بنگلہ ہے۔ دوسری طرف آموں کا باغ ہے۔ سامنے سڑک ہے۔''

''شام کو وہ گھومنے گھامنے تو نکلتے ہوں گے؟''

''ہاں نکلتے تو ہیں، لیکن پولیس کے ساتھ اپسر ساتھ رہتے ہیں۔''

''اگر کوئی اس باغ میں چھپ کر بیٹھے تو کیا ہو۔ جب انہیں اکیلے دیکھے خط پھینک دے۔ وہ ضرور اٹھائیں گے؟''

دیبی دین نے سوچ کر کہا: ''ہاں ہو سکتا ہے، لیکن اکیلے ملیں تب تو۔''

ذرا اور اندھیرا ہوا تو جالپا نے دیبی دین کو ساتھ لیا اور رمانا تھ کا بنگلہ دیکھنے چلی۔ ایک خط لکھ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ بار بار دیبی دین سے پوچھتی۔ اب کتنی دور ہے؟ سوچتی کہیں رما ٹہلتے ہوئے مل جائیں تو کیا پوچھنا ہے۔ خط کو رومال میں باندھ کر ان کے سامنے پھینک دوں۔

دفعتاً اسے ایک اندیشہ پیدا ہوا۔ کہیں وہ خط پا کر بھی اپنا بیان نہ بدلیں تو کیا ہو گا۔ کون جانے اب میری یاد بھی انہیں ہے یا نہیں۔ کہیں مجھے دیکھ کر وہ منہ پھیر لیں تو کیا ہو۔ اس خیال سے وہ سہم اٹھی۔

اس نے دیبی دین سے پوچھا: ''کیوں دادا وہ کبھی ہم لوگوں کا ذکر بھی کرتے تھے؟''

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا: ''کبھی نہیں۔ ہاں ادا اس بہت رہتے تھے۔''

اس جواب نے جالپا کو اور بھی تردد میں ڈال دیا۔ شہر کی گھنی بستی سے یہ لوگ دور نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دن کی تیز روی کے بعد اس وقت ہوا

بھی آرام کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت اور میدان چاند کی گرد آلود روشنی میں بے جان سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی کوششوں کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ اس کی بادیہ پیمائی بالکل بے سود ہے۔ اس بستی میں اس کی حالت بے کس لڑکے کی سی ہے، جو مٹھی بھر اناج کے لیے دربدر پھرتا ہو۔ وہ جانتا ہے اگلے دروازہ پر بھی اسے کچھ نہ ملے گا۔ شاید گالیاں ہی ملیں۔ پھر بھی دست سوال پھیلا ہے۔ یہ امید کا سہارا نہیں، مایوسی کا سہارا ہے۔

یکا یک سڑک کے داہنی طرف بجلی کی روشنی نظر آئی۔

دیبی دین نے ایک بنگلے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: ''وہی ان کا بنگلہ ہے۔''

جالپا نے مایوسانہ انداز سے ادھر دیکھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ تھا۔ پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بولی: ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

دیبی دین نے پھاٹک کے اندر جھانک کر کہا: ''شاید یہ بنگلہ چھوڑ دیا۔ دیکھو میں پتا لگاتا ہوں۔ بنگلے کے دائیں طرف آموں کے باغ میں روشنی نظر آئی۔ شاید کھٹک باغ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ دیبی دین نے باغ میں آ کر پکارا: ''کون ہے۔ یہاں کس نے یہ باغ لیا ہے؟''

ایک آدمی آموں کے جھرمٹ سے نکل آیا۔ دیبی نے اس پہچان کر کہا: ''ارے تم ہو جنگلی۔ تم نے یہ باغ لیا ہے؟'' جنگلی ٹھگنا سا گھٹیلا آدمی تھا۔ دیبی کی آواز پہچان کر کہا:

''ہاں دادا لے تو لیا ہے مگر کچھ ہے نہیں۔ گھاٹا ہی رہے گا۔ تم یہاں کیسے آئے؟''

دیبی: ''کچھ نہیں، یونہی چلا آیا۔ اس بنگلہ والے آدمی کہاں گئے؟''

جنگلی نے ادھر ادھر چوکنی آنکھوں سے دیکھ کر ان تینوں کو تاڑا۔ ان میں وہی مخبر ٹکا ہوا تھا۔ ''آج سب چلے گئے۔ سنتے ہیں پندرہ بیس دن میں آویں گے۔ پڑے لکھے آدمی بھی ایسے دگاباج ہوتے ہیں۔ دادا سراسر جھوٹی گواہی دی۔ نہ جانے اس کے بال بچے ہیں یا نہیں۔ بھگوان سے بھی نہ ڈرا۔''

جالپا وہیں کھڑی تھی۔ دیبی دین نے جنگلی کو اور زہر اگلنے کا موقع نہ دیا۔ بولا: ''پندرہ بیس دن میں آویں گے۔ خوب معلوم ہوا ہے۔''

''ہاں، وہی پہرے والے کہہ رہے تھے۔''

''کچھ معلوم ہوا ہے، کہاں گئے ہیں؟''

''وہی موقع دیکھنے گئے ہیں۔ جہاں واردات ہوئی تھی۔''

دیبی دین چلم پینے لگا اور جالپا سڑک پر آ کر ٹہلنے لگی۔ رما کی یہ توہین سن کر اس کا دل پاش پاش ہو گیا۔ اسے رما پر غصہ نہ آیا۔ رنج بھی نہ ہوا۔ بلکہ اسے ہاتھوں کا سہارا دے کر اس دلدل سے نکالنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ رما چاہے اسے دھتکار ہی کیوں نہ دے، مگر وہ اسے معصیت کے اس غار میں نہ گرنے دے گی۔

جب دونوں یہاں سے چلے تو جالپا نے پوچھا: ''اس آدمی سے کہہ دیا ہے کہ جب وہ آئیں ہمیں خبر دے دے۔''

''ہاں کہہ دیا ہے۔''

ایک مہینہ گزر گیا۔ گوپی ناتھ پہلے تو کئی دن کلکتہ کی سیر کرتا رہا، مگر چار پانچ دن میں ہی یہاں سے اس کا جی ایسا اچاٹ ہوا کہ گھر کی رٹ لگانی شروع کی۔ آخر جالپا نے اسے لوٹا دینا ہی اچھا سمجھا۔ یہاں تو وہ چھپ چھپ کر رویا کرتا تھا۔

جالپا کئی بار رما کے بنگلے تک ہو آئی۔ وہ جانتی تھی کہ رما نہیں آئے ہیں۔ پھر بھی وہاں کا ایک چکر لگا آنے میں اسے ایک عجیب تسلی ہوئی تھی۔

جالپا کچھ پڑھتے پڑھتے یا لیٹے لیٹے تھک جاتی تو ایک لمحہ کے لیے کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ایک دن شام کو وہ کھڑکی کے سامنے آئی تو سڑک پر موٹروں کی قطار نظر آئی۔ تعجب ہوا، اتنی موٹریں کہاں جاتی ہیں۔ غور سے دیکھنے لگی۔ کل چھ موٹریں تھیں۔ ان میں پولیس کے افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ آخری موٹر پر اس کی نگاہ پڑی تو سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ وہ ایک محویت کے عالم میں کھڑکی سے زینے تک دوڑی ہوئی گئی۔ گویا موٹروں کو روک لینا چاہتی ہو، لیکن اتنی ہی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ میرے نیچے پہنچتے ہی موٹریں نکل جائیں گی۔ وہ پھر کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ رما اب بالکل سامنے آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جالپا نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا لیکن حیا مانع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ رما کی موٹر کچھ دھیمی ہو گئی ہے۔

دیبی دین کی آواز بھی سنائی دی، مگر موٹر رکی نہیں۔

جالپا نے زینے پر آ کر کہا: ''واہ!''

دیبی دین نے سامنے آ کر کہا: ''بھیا آ گئے۔ وہ کیا موٹر جا رہی ہے۔''

یہ کہتا ہوا وہ اوپر گیا۔ جالپا نے شوق تجسس کو شرم سے دباتے ہوئے کہا: ''تم سے کچھ کہا؟''

دیبی: ''اور کیا کہتے کھالی رام رام کی۔ میں نے خیریت پوچھی۔ دونوں ہاتھوں سے دلاسا دیتے چلے گئے۔ تم نے دیکھا کہ نہیں۔''

جالپا نے سر جھکا لیا: ''دیکھا کیوں نہیں، کھڑکی پر کھڑی تھی۔''

''انہوں نے بھی تمہیں دیکھا ہوگا۔''

''کھڑکی کی طرف تو تاکتے تھے۔''

''بہت چکرائے ہوں گے کہ یہ کون ہے؟''

''کچھ معلوم ہوا۔ مقدمہ کب پیش ہوگا؟''

''کل ہی تو۔''

''تب تو جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیے۔ میرا خط کسی طرح انہیں مل جاتا تو کام بن جاتا۔ دیبی دین نے اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہے، تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتی ہو اتنا آسان نہیں ہے۔

جالپا نے اس کے دل کی کیفیت سمجھ کر کہا: ''کیا تمہیں شبہ ہے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کرنے پر راضی نہ ہوں گے؟''

دیبی دین کہ اب اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بولا: ''ہاں بہو جی! مجھے اس کا بہت بڑا اندیشہ ہے اور سچ پوچھو تو ہے بھی جوکھم۔ اگر وہ بیان بدل بھی دیں تو پولیس کے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ وہ کوئی دوسرا الزام لگا کر انہیں پھر

پکڑے گی اور کوئی نیا مقدمہ چلا دے گی۔''

جالپا نے ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا اسے اس کا بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ پھر پکڑے گی اور کوئی پولیس کے پنجے سے بچانے کا ٹھیکہ نہیں لیتی۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ ممکن ہو تو انہیں رسوائی سے بچا لوں۔ اگر وہ سچ مچ ڈکیتیوں میں شریک ہوتے تب بھی میں یہی چاہتی کہ آخر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہیں۔ میں یہ کبھی پسند نہ کرتی کہ وہ دوسروں کو دغا دے کر مخبر بن جائیں، لیکن یہ معاملہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ میں یہ کسی طرح نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ اپنی غرض کے لیے جھوٹی شہادت دیں۔ اگر انہوں نے اپنا بیان نہ بدلا تو میں عدالت میں جا کر ساری قلعی کھول دوں گی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے قطع تعلق کر لیں۔ میری صورت نہ دیکھیں۔ یہ مجھے منظور ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے بے گناہوں کا خون ان کی گردن پر ہو۔

دیبی دین نے اسے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''تم سب کچھ کر لو گی بہو جی! اب مجھے بسواس ہو گیا۔ جب تم نے کلیجہ اتنا مضبوط کر لیا ہے، تو تم سب کچھ کر سکتی ہو۔''

''تو یہاں سے نو بجے چلیں؟''

''میں تیار ہوں۔''

وہ رماناتھ، جو پولیس کے خوف سے باہر نہ نکلتا تھا، جو دیبی دین کے گھر میں چوروں کی طرح پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا، آج دو مہینوں سے رئیسانہ عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آسائش کے سبھی سامان موجود ہیں۔ خدمت کے لیے چوکیداروں کی ایک فوج، کھانا پکانے کے لیے کاشمیری باورچی بڑے بڑے افسر اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے۔ اس کے منہ سے بات نکلی نہیں کہ پوری ہوئی۔ اتنے ہی دنوں میں اس کے مزاج میں اتنی نفاست آ گئی ہے، گویا وہ خاندانی رئیس ہو۔ اسے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ رات کو وہ افسروں کے ساتھ سینما یا تھیٹر دیکھنے جاتا ہے۔ شام کو موٹروں کی سیر ہوتی ہے۔ دلچسپی کے نت نئے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔ جس دن مجسٹریٹ نے ملزموں کو سیشن سپرد کیا، سب سے زیادہ خوشی رما کو ہوئی۔ گویا اس کی خوش نصیبی کا ستارا طلوع ہو رہا ہے۔

پولیس کو معلوم تھا کہ سیشن جج کی عدالت میں یہ گھر کی کھیتی نہ ہوگی۔ اتفاق سے جج صاحب ہندوستانی تھے۔ اور حق پروری کے لیے بدنام پولیس ہو یا ملزم، ان کی نگاہ میں دونوں برابر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ رو رعایت نہ کرتے تھے۔ اس لیے پولیس نے ایک بار رما کو ان مقامات سے روشناس کرا دینا ضروری سمجھا، جہاں وارداتیں ہوئیں تھیں۔ ایک زمیندار کے سجے سجائے بنگلے میں یہ جماعت فروکش ہوئی۔ دن بھر لوگ شکار کھیلتے۔ رات کو گراموفون سنتے۔ تاش کھیلتے یا بجرے پر ندی کی سیر کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شہزادہ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ان دلچسپیوں میں رما کو کوئی آرزو تھی، تو یہ کہ جالپا بھی یہاں ہوتی۔ اب تک وہ محتاج تھا۔ اس کی